عہدِ سرسید میں اردو ناول نگاری کے چار رجحانات

ڈاکٹر سجاد نعیم*

Abstract:

Due to the political influence of British people on the sub-continent there started the effect western civilization. In literature new forms emerged. Alongwith poetry, essay writing, history and journalism also found their way. With the translation of western literature the Indian society imbed the quality of western literature come to know about it. And due to it literature of sub-continent start moving towards writing in the domain of realism. The change of the subject in the literature and new forms the traditional imaginative story telling got replaced with the novel. On the literary seen movement propagated by Sir Syed Ahmad Khan could not be ignored. The foundation stone of Urdu novel is also related to movement of Sir Syed in which Deputy Nazir Ahmad and his novel are also prominent. In the age of Sir Syed there are four important dimension of novel writing. Pandat Ratan Nath Sarshar made the local the subjects of culture and society in his novel against the tradition of Deputy Nazir Ahmad which was the depiction of surface level morality and Hadi Ruswa for the first time laid out the individual of inner feelings and made novel worth full. These dimensions of urdu novel in the late 19th Century are the gift of these thought, wisdom and educational prospective related to Sir Syed and his contemporary. In this background a meaningful study brings out many aspects.

انیسویں صدی برصغیر میں بہت سی تبدیلیوں کی صدی ہے۔اس عہد کے تقاضوں کو وقت کے ساتھ منسلک کرنے میں سرسید تحریک کا اہم کردار ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔ بدلتے عہد نے ہر چیز کو متاثر کیا، سماجی، معاشرتی

* شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

اورتہذیبی اصلاح کی سمت متعین ہوئی اور صحیح معنوں میں جدید ادب اور نئی زندگی کا سفر شروع ہوا، اس تحریک سے پورا برصغیر متاثر ہوا۔(۱)

۱۸۵۷ء کا واقعہ ایک تشریحی نکتہ ہے جس کی مدد سے سرسید کی فکر کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ یہ واقعہ مقامی بیانیے کی رو سے جنگ آزادی جبکہ انگریزوں کی نظر میں بغاوت ٹھہرا۔ یہ محض تصادم نہیں تھا بلکہ زوال آمادہ مشرقی معاشرے اور ایک جدید فکری وسائنسی رجحان کے مابین فیصلہ کن جنگ بھی تھی جس نے مغرب کی برتری کو ثابت کیا۔ اس عہد کے دانشوروں اور عصر شناسوں کے ہاں یہ احساس شدت سے موجود تھا کہ بھلائی اسی میں ہے کہ مقامی لوگ تعلیم اور معاشرت کے بارے مثبت موقف اختیار کریں۔(۲)

سرسید نے انگریزوں کو ۱۸۵۷ء کی اصل صورتحال سے آگاہی فراہم کرنے کے لئے ''اسباب بغاوت ہند'' میں ویسے تو بہت سے اسباب گنوائے ہیں جن میں سیاسی وسماجی ناانصافیوں کی طرف اشارے بھی ہیں مگر ایک اہم سبب مذہب کو لاحق خدشات بھی تھے۔ سارے ہندوستان میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ نئی حکومت سارے ہندوستانیوں کو عیسائی بنادے گی اور ان پر بدیسی رسم ورواج تھوپ دیئے جائیں گے اور کچھ ایسا ہوا بھی جس سے اس خدشے کو تقویت مل رہی تھی۔ مثلاً عیسائی مبلغین کی طرف عیسائیت کی تبلیغ، مشنری سکولوں میں بچوں سے سوال کرکے پادری کی مرضی کے مطابق جواب دینے والوں کو انعامات دیئے جاتے۔ انگریزی زبان کی تدریس کو اسی خدشے کی ذیل میں شمار کیا گیا۔ سرسید احمد خاں کو اس صورتحال کا ادراک تھا۔ ان کے سامنے دو محاذ تھے ایک وہ انگریزوں کو قائل کررہے تھے کہ مسلمانوں کی طرف معاندانہ رویے کے کچھ منطقی اسباب ہیں۔ جبکہ دوسرا محاذ اس سے بھی مشکل کہ اپنے لوگوں کو بدلتی صورتحال کا ادراک کروایا جائے۔ انگریزی زبان اور جدید مغربی علوم کو عصری زندگی کا حصہ اور انگریزی زبان کو بطور ذریعہ تعلیم اپنانے کے حق میں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اردو میں تعلیم دینے سے تعلیم کے بنیادی مقاصد کا حصول ممکن نہیں کیونکہ اس زبان میں علمی کتابوں کی کمی تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی بھی قائم کی تھی تاکہ مغربی علوم فنون کا ترجمہ کیا جائے، یہ سرسید کی ابتدائی کاوش تھی۔

سرسید کا مذہبی تصور اس روایتی تصور سے مختلف تھا جو علم اور ترقی کے راستے میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ وہ اس موقف کے حامی تھے کہ اسلام میں کوئی بات خلاف عقل نہیں، مذہبی رواداری کے حمائتی تھے، وہ ہر مذہب کا احترام کے حق میں تھے۔ انہوں نے تو کبھی بت شکنی کو بھی جائز نہیں سمجھا۔ ان کے نزدیک مذہب ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔(۳)

وہ قدیم ہندوستان کی تہذیبی تاریخ سے نہ نا صرف واقف تھے بلکہ اس کی دانشورانہ عظمت کے بھی معترف تھے۔ وہ ہندوستانیوں کی مختلف علوم میں دسترس کو بہت فخر سے پیش کرتے، سرسید کی آنکھ اب بدلتی صورتحال کا

بھی گہرا تجزیہ کر رہی تھی، اس تبدیلی نے ادیبوں سے موجود زندگی کے نئے مطالبے کو مخصوص زاویوں سے دیکھنے کا تقاضا کیا۔ سرسید کے اصلاحی اور تعلیمی تحریک نے منطقی انداز میں گفتگو اور انگریزی اسالیب کو اردو کا حصہ بنانے کی کاوشیں کیں۔ یہی وہ حقیقی جدید اور منطقی استدلالی انداز تھا جو ناول کے لئے موزوں ٹھہرا۔ اگر سرسید کی تحریک نہ ہوتی تو شاید اردو ناول کو بیسویں صدی کا انتظار کرنا پڑتا۔

۱۸۳۳ء کے قانون میں یکساں حقوق کی ضمانت دی گئی تو انفرادی ترقی کے راستے کھلے خود اعتمادی پیدا ہونے سے فرد اور سماج کے درمیان کشمکش پیدا ہونا فطری امر تھا۔ پیداواری وسائل کی تبدیلی نے معاشی نظام بدلا تو پیداواری رشتوں کے نئے زاویے وجود میں آنے لگے۔ سیاسی اور سماجی شعور کا بڑھتا ہوا احساس ادب میں خیالی اور تصوراتی کی جگہ حقیقی زندگی کا ظہور ہوا جو اس دور کی سماجی ضرورت بھی تھی۔

نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار نذیر احمد نے جاگیرداری ماحول میں آنکھیں کھولیں جبکہ انیسویں صدی کا بدلتا برصغیر ان کی زندگی کا حصہ بنا۔ نذیر احمد نے اپنے ناولوں کا زیادہ تر مواد اسی عہد سے کشید کیا۔

نذیر احمد اور سرسید کی واقفیت ''آثار الصنادید'' کے وقت سے ہوگئی تھی اور ان تعلقات میں زیادہ قربت ۱۸۷۰ء میں ''مراۃ العروس'' کی اشاعت کے بعد ہوئی۔ سرسید احمد کے خیالات اور نظریات کو ایک معتدل اور متوازن انداز میں پیش کرنے کا کام نذیر احمد نے بڑی کامیابی سے انجام دیا۔(۴)

سرسید دلی کالج کے کبھی طالب علم نہیں رہے جبکہ نذیر احمد کو اس کالج کے توسط سے انگریز ساتھیوں کی قربت کے سبب نئی تہذیب سے شناسائی کا زیادہ موقع ملا، یوں سرسید کے مقابلے میں نذیر احمد نے براہِ راست جدید علوم سے واقفیت حاصل کی۔ نذیر احمد کا شمار سرسید کے ان ساتھیوں میں تھا جنہوں نے مغربی تعلیم اور بالخصوص انگریزی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ''مراۃ العروس'' اور ''بنات النعش'' تصنیف ہونے کے بعد اس تحریک کو مزید تقویت ملی۔

نذیر احمد کے ناولوں میں شمالی ہند کے متوسط گھرانوں کی خواتین ان کی نفسیات اور اس عہد کے خیالات اور رجحانات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں جنہیں ایک دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ برصغیر میں یہ عہد مشرقی اور مغربی تہذیب کے ملاپ اور تصادم کا دور بھی تھا جس نے تیسرے طبقے کو جنم دیا۔ ہندوستان کی سست رفتار اور توہم پرست زندگی کے مقابلے میں جدید علوم اور عقلیت پسندی نے مقامیوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کیا۔ ''توبۃ النصوح'' اور ''فسانۂ مبتلا'' کے کردار اسی عہد اور طبقے کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ سب کچھ لٹنے کے باوجود بھی ہر چیز کو رسم و رواج کی عینک سے دیکھا جا رہا ہے۔

اکثر لوگ نذیر احمد کو مذہب کے خلاف سمجھتے تھے کچھ تو اسے بغاوت کا درجہ بھی دیتے، حالانکہ یہ بغاوت

مزہب کے خلاف نہیں بلکہ فرسودہ مذہبی تحقیق کے خلاف تھی، ''امہات الامۃ'' کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ ''مراۃ العروس'' سماجی اور معاشرتی بغاوت تھی۔ انہوں نے مسلمان گھرانوں میں عورتوں کے رویوں اور ان کی معاشرت کو موضوع بنا کر جرات مندانہ کام کیا۔ اس ناول کی تصنیف کا مقصد بالتفصیل دیباچے میں بیان کر دیا تھا۔ وہ ایک جدید طرز کو رواج دینا چاہتے تھے، یہ ناول ایک بدلے ہوئے ذہن کا پتا دیتا ہے، ناول میں گھر بگڑنے اور سنورنے کی داستان میں عورت کو ایک مرکز کے طور پر دکھایا گیا۔ یہ ناول اٹھارویں صدی کے مغربی ناولوں کی ذیل میں آئے گا۔ ناول کی اگر علامتی سطح تلاش کی جائے تو یہ ہندوستان کے عروج وزوال کی کہانی بھی ہے۔

''''مراۃ العروس' کو ہندوستان کے عروج وزوال کی کہانی بھی کہہ سکتے ہیں۔''**(۵)**

نذیر احمد مقصدی ناولوں میں مسلمانوں کے قدیم تعلیمی نظام سے بھی مطمئن نظر نہیں آتے اور مغرب سے استفادے میں بھی خاص اصول رکھتے ہیں انہوں نے اقامتی سکولوں کی جگہ لڑکیوں کے لئے ''گھریلو نظام تعلیم'' کا تصور پیش کیا۔ علی گڑھ تحریک نے تو تعلیم نسواں کی بات بہت تاخیر سے کی تھی جبکہ نذیر احمد بہت پہلے سے اس کے حامی ہیں۔ گویا اس اولیت کا سہرا انہیں کے سر ہے۔

نذیر احمد کے پہلے ناول ''مراۃ العروس'' کے تین برس بعد ۱۸۷۲ء میں بنات النعش شائع ہوا۔ اس کا موضوع بھی تعلیم وتربیت یا مزید تربیتِ خانہ داری ہے۔ اسے ''مراۃ العروس'' کا دوسرا حصہ بھی کہا جاتا ہے۔ اصغری خانم کے قائم کردہ مدرسہ میں ناول کا مرکزی کردار ''حسن ارا'' معلومات عامہ کے بارے میں صفر ہے۔ مگر اصغری نے اس کی کایا پلٹ دی اور باتوں باتوں میں دنیا جہان کی باتیں ازبر کرا دیں۔ ناول میں واقعات کی بجائے معلومات پر زور دیا گیا ہے۔ نذیر احمد کا یہ اندازِ تربیت بھی مغرب کا دیا ہوا ہے۔ اُس عہد میں ایسا جدید انتظام سوچنا جرات وہمت کا کام تھا جبکہ دلی والے بھی عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہوں۔ نذیر احمد کا قدیم مسلم معاشرے سے انحراف کی اہمیت کا اندازہ اس وقت کے ہندوستان سے ہوسکتا ہے۔ یہ کاوش ان کی انفرادی تھی اس وقت تک سرسید بھی تعلیم نسواں کے اتنے معترف نظر نہیں آتے۔ ''بنات النعش''، مراۃ العروس کے مقابلے میں فنی اعتبار سے بہتر ہے اسے مکمل تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس ناول پر ''مراۃ العروس'' کے مقابلے میں نصف انعام ۵۰۰ روپے سے نوازا گیا۔ شاید حکام نذیر احمد کے گھریلو تعلیم کے ماڈل سے خوش نہیں تھے۔ کیونکہ یہ ماڈل سرکاری تعلیمی نظام جو زیادہ ترقی یافتہ تھا سے مختلف تھا۔ نذیر احمد بھی کم انعام ملنے پر ناخوش تھے۔

> ''یہ ناول حکومت کی تعلیمی اسکیموں کے برخلاف ایک دوسرے قسم کے نظام تعلیم کی تلقین کرتا ہے۔ یہ گھریلو تعلیم کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس سے حکومت کے اسکولی نظام کی درپردہ مخالفت ہوتی ہے اس لیے حکومت نے اس کا اس گرم جوشی سے خیر مقدم نہیں کیا۔''**(۶)**

اس ناول میں تعلیم کے لئے کھیل کی تکنیک کو اپنایا گیا ہے جس میں قصے سے زیادہ نظریہ تعلیم پر زور دیا گیا ہے۔

> ''نذیر احمد نے بنات النعش میں جس تعلیم کا طریقہ اپنایا ہے وہ Play Way ہے جو مغرب سے مستعار ہے۔ نذیر احمد نے اس طریقہ کار کو اپنا کر مسلم معاشرہ کی لڑکیوں کو گھر کی چار دیواری میں تعلیم دینے کا وسیلہ پیدا کر دیا جو آج کی مستورات کے لئے بھی کار آمد ہے۔''(۷)

''توبۃ النصوح'' بھی سابقہ ناولوں ہی کی کڑی ہے۔ اس ناول میں امورِ خانہ داری اور تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی شامل کیا گیا۔ نذیر احمد نے اسے شائع کروانے سے پہلے ولیم میور اور ایم کیمپس کو اصلاح کی غرض سے دکھایا، ترمیم و اضافے کے بعد اس میں فنی حسن نمایاں ہے۔ دلچسپ اندازِ بیاں کے سبب اس ناول کو بہت زیادہ پذیرائی ملی۔ ناول میں بچوں کی تعلیم و تربیت میں والدین کی ذمہ داریوں کے ساتھ ان کی اپنی زندگی کو بھی بچوں کے لئے نمونہ بنانے پر زور دیا گیا ہے۔

> ''مولوی صاحب یہ ناول ہندو مسلمان سب کے لیے لکھنا چاہتے تھے لیکن بقول خود ان کے کسی ایک خاندان کا انتخاب تو کرنا ہی تھا۔ چنانچہ ایک مسلمان گھرانے کا انتخاب کیا لیکن باقی تمام چیزیں ایسی ہیں کہ مسلمانوں کی جگہ ہندوؤں کی رکھ دو تب بھی کوئی فرق نہ پڑے مثلاً نماز کی جگہ پوجا پاٹ کر دو، روزے کے بجائے برت، خیرات و زکوٰۃ کی جگہ دان پُن لکھ دو۔ اس بیان سے مولانا کی وسعتِ قلب کا اندازہ ہوتا ہے۔''(۸)

اگر چہ ان کے ناولوں کے ماخذات مغربی ناولوں سے کشید کئے گئے ہیں مگر نذیر احمد کا یہ فنی اعجاز ہے کہ انہوں نے مشرقی فضا کو ناول کے اندر اس طرح سے سمو دیا ہے کہ یہ مقامی ماحول اور معاشرت میں ڈھل گئے ہیں۔ توبۃ النصوح میں بھی ایک مقامی فضا موجود ہے۔ جس میں مذہبی اور اخلاقی زندگی کو خانگی پس منظر میں پیش کیا گیا۔ کبھی کبھی کلچر اور مذہب کی پیکار کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ نذیر احمد کے سامنے مقصدی پہلو تھا اس لئے یہ تصادم یا ٹکراؤ انتہائی سطح کا نہیں ہے۔

> ''اس ناول میں مذہب اور کلچر کے درمیان کشمکش بھی دکھائی دیتی ہے۔ نذیر احمد نہیں چاہتے تھے کہ ایسی ظاہر داری جو مرزا ظاہر دار بیگ کی طرح کسی وقت کام نہ آ سکے اور جو انسان کو بجائے عقلمند کے احمق بنا دے ہمارے معاشرے میں رواج پائے۔ نذیر احمد نے کلیم کو فن دوست اور نصوح کو فن دشمن دو متضاد صفات کا حامل بتایا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے فن اور ادب کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کی بنیاد پر

اکثر ناقدین کا یہ اعتراض ہے کہ نذیر احمد آرٹ کو ادب میں دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔لیکن نذیر احمد آرٹ برائے آرٹ یا ادب میں افادیت اور مقصدیت کے پہلو کے متلاشی تھے وہ ایسے ادب اور آرٹ کو مضر بلکہ مہلک قرار دیتے تھے جس کی رنگینی میں ہمارے قوم کے ہونہار کھوکر رہ جائیں۔''(۹)

ناول میں ماحول کے شخصیت پر اثرات کو موازنے کی صورت میں دکھا کر یہ بات ناول کے قالب میں ڈھال دی گئی ہے کہ وقت اور ماحول بدلنے سے انسان میں بھی تبدیلیاں آجاتی ہیں۔

ناول کا کردار ''علیم'' پادری کی وعظ سے متاثر ہوکر ایک عمر رسیدہ عورت کی مدد کرتا ہے تو نذیر احمد کا مذہب کے بارے میں تصور بھی سمجھ آتا ہے کہ عمدہ، قدریں جس مذہب سے ملیں اپنا لینا چاہئے۔کوئی بھی مذہب گمراہ کرنے والا نہیں ہوتا۔یہ ناول نذیر احمد کی علمی بصیرت اور وسیع القلبی کا آئینہ دار ہے۔

''ابن الوقت'' میں قوموں اور تہذیبوں کے متعلق آفاقی مسئلے کو ناول کا موضوع بنایا گیا ہے اور یہ تہذیبی تصادم آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔''ابن الوقت'' اور رویائے صادقہ کے مطالعے سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ نذیر احمد تہذیب وتمدن کو مذہب سے الگ ماننے کے لئے تیار نہیں ناول میں ملک وقوم کے زندہ اور متحرک عناصر کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔

ناول نذیر احمد کی قدرے فکری تبدیلی کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ یہ ناول اپنے عہد کے وسیع تناظر میں ایک مکمل سیاسی اہمیت رکھتا ہے۔بعض ناقدین ابن الوقت کو سرسید کی تمثیل اور حجۃ الاسلام کو نذیر کا قائم مقام بتاتے ہیں۔(۱۰)

''عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مولوی صاحب نے ابن الوقت کے پردے میں سرسید کو طنز کا نشانہ بنایا ہے کیونکہ انہوں نے انگریزی طرز معاشرت کو اختیار کرلیا تھا۔ سید افتخار عالم نے لکھا ہے سرسید کے بیٹے سید محمود، مولوی صاحب سے خفا تھے کہ انہوں ے سرسید کا مذاق اڑایا۔مولوی صاحب کا جواب تھا کہ ''میں نے تو انگریزی وضع کے مقلدوں کو ملاحی گالیاں دی ہیں جو چاہے گالیاں اپنے اوپر لے۔''(۱۱)

ایامیٰ ایک اصلاحی ناول ہے جس میں بیوگی سے پیدا ہونے والے مسائل ومصائب کو موضوع بنایا گیا۔ نذیر احمد نکاح ثانی کی متعدد ضرورتوں کو ایک اہم معاشرتی، نفسیاتی اور معاشی تناظرات میں دیکھ رہے تھے۔انہوں نے ناول کے مرکزی کردار آزادی بیگم کو حوصلہ مندی، دانش اور آزادیٔ اظہار کی طاقت عطا کی۔ مذہبی مسائل پر اس طرز کا جرات مند تکلم عورت کی زبانی ناممکن تصور کیا جاتا تھا۔نذیر احمد کا اصلاحی اور مقصدی انداز بے لذت واعظ میں ڈھلنے کی بجائے گہری بصیرت اور سیاسی وسماجی شعور کا حامل ہے۔سرسید تحریک کے تحت ان کے مقصدی اور اصلاحی

رجحان نے بہت سے دیگر لکھنے والوں کو بھی متاثر کیا۔ ان کے مقلدین کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جو اسی زاویے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں عبدالحامد کے دوناول ''تحفۃ العروس'' اور ''زینت العروس'' جن میں شادی بیاہ اور اسرافِ بے جا کو ناولوں کا موضوع بنایا گیا۔ ظہیر بلگرامی کا ''فوائد النساء'' اور خواجہ الطاف حسین حالی کا واحد ناول ''مجالس النساء'' اسی روایت کا تسلسل ہیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار:

نذیر احمد کے بعد اردو ناول کا اہم زاویہ پنڈت ناتھ سرشار ہیں انہوں نے اردو ناول کو زندگی کا پھیلاؤ اور وسعت عطا کی۔ سرشار نے لکھنؤ کی رنگا رنگی، تہذیب، بول چال، میلے ٹھیلوں اور جیتی جاگتی زندگی کا بھرپور نقشہ پیش کیا ہے۔

> ''وہ حقیقی دنیا کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ ایک سوسائٹی ایک شہر ایک ماحول کے بہت سے پہلو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ اس میں واقعیت ہے مزاح ہے اور زندگی پر ایک خاص نظر ہے۔ اس کا فارم بھی اگر ہے اُسی قسم کے ناول کا ہے جسے پکارسک Pic Aresque کہتے ہیں اور سب سے زیادہ بات تو یہ ہے کہ زندگی کو جس حسن و خوبی کے ساتھ یہاں زندہ کیا گیا ہے ویسا اُردو کی کسی تصنیف میں بھی نہیں کیا گیا۔''(۱۲)

سرشار کے نالوں کے کردار دھرتی سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ عام لوگ ہیں۔ ان کا تعلق ہر طبقے اور مذاق سے ہے جن سے لکھنؤ کی زندگی میں ایک حرکت نظر آتی ہے۔ نذیر احمد کی نسبت سرشار کا زندگی کا عمیق مشاہدہ ہے جبکہ نذیر کے ہاں زندگی کے اتنے ہمہ گیر تناظر نظر نہیں آتے۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے پنڈت برج کشن گٹو کے مضمون سے یوں حوالہ دیا ہے۔

> ''سرشار جب راہ گلی چلتے تو آنکھ اور کان کھول کر چلتے تھے۔ کہیں مچھلی والا لالہ سے لڑ رہی ہے۔ کہیں دھوبن دھوبی سے الجھ رہی ہے۔ کہیں کہار ڈولی لئے جا رہے ہیں۔ کہیں بھٹیارن مسافر سے راز و نیاز کی باتیں کر رہی ہے۔ کہیں چینی بازار اور چینا بازار کی بحث افیونیوں میں چھڑی ہوئی ہے۔''(۱۳)

سرشار کا ایک قومی نقطۂ نظر ہے وہ ہندوستان کو مذہب کے خانوں میں تقسیم نہیں کرتے۔ وہ ہند اسلامی تہذیب کے داعی ہیں۔ ان کے ناولوں میں انسان دوستی کا تصور مستحکم صورت میں دکھائی دیتا ہے۔

1857ء کے ہنگامہ خیز واقعے کے بعد اصلاحی تحریکوں کے ذریعے نئی زندگی کے تقاضوں کو دانشور طبقے اپنے اپنے انداز میں پیش کر رہے تھے۔ اور سرشار نے بھی اپنی دانش سے تہذیب کو تخلیقی رنگ دیا۔

> ''انہوں نے فرسودہ رسم و رواج، توہم پرستی، تنگ نظری اور جہالت کے خلاف آواز

بلند کی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد، تعلیم نسواں اور مذہبی رواداری کے حامی تھے اور قومی ترقی کے لئے اسے ضروری سمجھتے تھے۔''(۱۴)

شمالی ہند میں مشترکہ تہذیب کی ابتدائی صورتیں ملتی ہیں۔ جبکہ لکھنؤ میں اس کے اثرات زیادہ نمایاں تھے اور تہذیبی تبدیلیاں عام سطح اور عوام کو بھی متاثر کر رہی تھیں۔ ہندو، مسلمانوں کے رہن سہن، مجلس آداب اور سماجی رویوں میں فرق کرنا مشکل تھا۔ سرشار اس مشترکہ تہذیب کی علامت ہیں اور ان کی تصانیف اس کا ثبوت ہیں۔

''ان کی تصانیف میں ان کے عہد کے عام رجحان کے برعکس، کہیں بھی مذہبی تبلیغ، مذہبی پاسداری یا احیا پرستی کی جھلک نہیں ملتی۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ سرشار اُردو کے پہلے ادیب ہیں جنہوں نے ایک واضح سیکولر نقطۂ نگاہ سے زندگی کو دیکھا اور پیش کیا۔ سرعبدالقادر کا یہ خیال صحیح ہے کہ ان کی تخلیقات میں، سوائے ان کے نام کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہ ایک ہندو ادیب کا نتیجہ فکر ہیں۔''(۱۵)

سرشار صحیح معنوں میں ترقی پسند تھے وہ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے درمیان بھی ایک سنگم تھے۔ ''فسانہ آزاد'' میں اس کی جھلکیاں موجود ہیں۔ سپر آرا کا کردار اس نظریے کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ جو ترقی پسند ہونے کے ساتھ مقامی گردوپیش اور سماجی بندھنوں میں جکڑا رہنا چاہتا ہے۔ سرشار سرسید کی مانند قومی جذبے کی حامل شخصیت تھے۔ انہیں بھی ہندوستانیوں کی جہالت پر رونا آتا تھا۔

''سرسید اس فکر کے بہت بڑے علمبردار تھے اور سرشار ان کی اصلاحی تحریک کے بہت قائل تھے۔''(۱۶)

ذیل کے ٹکڑے میں سرسید اور سرشار میں کئی مماثلتیں تلاش کی جاسکتی ہیں۔

''الٰہی یہ کیسی ہوا بندھی کہ پیارے ہندوستان کے علم وفن کا پھولا پھلا چمن اداس ہو گیا۔ اولعزمی کی ہری بھری شاخیں ایک ہی جھونکے سے پھٹ پڑیں۔ عظمت کے تن آور اور بار آور درخت اُڑ اُڑ کر زمین پر آرہے۔ خزاں کے لشکر نے ایسا حملہ کیا کہ بہار علم کا عمل کھڑے کھڑے اُٹھ گیا۔ اب اہلِ ہند میں وہ جوش نہ وہ خروش ہے جسے دیکھو بادۂ غفلت کے نشے میں مدہوش ہے۔ خوابِ خرگوش میں پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ بلا کی نیندیں اُمڈ آتی ہیں، خیر نیند بھر کر سو چکے۔''(۱۷)

وہ سرسید کی تعلیمی تحریک کے بھی حمائتی تھے۔ وہ تعلیم کی ضرورت کو سمجھتے تھے۔ اور نذیر کی طرح وہ بھی عورتوں کی تعلیم کے سخت حامی تھے۔

''سرشار تعلیم نسواں کے اس قدر حامی ہیں کہ انہوں نے فسانہ آزاد میں میڈا ادر کلریسا

> سے تعلیم نسواں کا ایک کالج جاری کرایا اور وہاں اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا بندوبست بھی کیا گیا۔
>
> سرشار بچوں کو انگریزی سکول میں بھیجنے کے حامی تھے اور ساتھ ہی پرانی قدروں کو بھی آپ چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اسی لئے آزاد کے جسم میں سرشار کی روح رقص کرتی نظر آتی ہے۔''(۱۸)

سرشار سماجی ترقی کو مذہب سے بڑا سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک دھرم، بھونڈی باتوں کی پیروی ہے۔ جن رسموں کو مذہبی خیال کرتے ہیں ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ مشرقی تہذیب سے اس قدر جڑنے کے باوجود بھی ہر اچھی بات کو چاہے اس کا تعلق کسی خطے سے بھی ہو سماجی زندگی کا نصب العین بنانا چاہتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں ترقی پسند تھے۔ سرشار کا مغربی زندگی کا براہِ راست تو مشاہدہ نہیں تھا۔ لیکن مغربی ادب کے مطالعے نے ان میں تجزیاتی اور مشاہداتی بصیرت کو افزوں تر کئے رکھا۔ اسی سبب وہ تہذیبی اور اقتصادی مسائل کو پرکھنے کا ہنر رکھتے تھے۔ وہ معمولی واقعات سے نتائج اخذ کرتے اس لئے ان کے ناولوں میں بہت سے چہرے بے نقاب ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

> ''سرشار، انگلستانی قوم، سماج اور فرد کے ماڈل ہی کو مشعلِ راہ پاتے ہیں۔ یورپ کی دیگر ترقی یافتہ اقوام اور افراد بھی انگلستان کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں۔''(۱۹)

سرشار کے ہاں متحرک کرداروں کی رنگا رنگی ہے یہ کردار ہمہ وقت ایسی کشمکش سے دوچار ہیں جو جدید زمانے کی سماجی اور سائنسی ترقیوں کو بھی قبول کر رہے ہیں اور نہ ہی ماضی سے دست بردار ہونے کو تیار ہیں۔ بلکہ دونوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ قدیم معاشرت حال کے تقاضوں کے منافی ہے۔ سرشار کے رجحان میں کئی ناول تحریر ہوئے۔ ان رجحانات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

''فسانہ آزاد'' کی تتبع میں لکھے گئے ناول جن میں معاشرت کے کمزور پہلوؤں کو موضوع بنا کر مذاق کا نشانہ بنایا گیا۔ جس کی بہتر مثال منشی سجاد حسین ہیں۔

دوسرا زاویہ نذیر اور سرشار کے امتزاج سے جنم لیتا ہے جن میں معاشرے کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اصلاح کا پہلو بھی موجود ہے۔

تیسرا رجحان رومانیت کا ہے جس میں معاشرت کی عکاسی کے لئے حسن و عشق، ہجر و وصال اور جنس و ہوس کا سہارا لیا گیا ہے۔

> ''اردو مزاح نگاری کی تاریخ میں 'فسانہ آزاد' ایک ایسا لازوال قہقہہ ہے جس کی گونج ہر عہد میں سنائی دیتی رہے گی۔ اس قہقہے میں اتنی توانائی اور قوت ہے کہ وقت کے سردار

اور ظالم ہاتھ بھی اس گونج کی لکیروں کو خاموش نہیں کر سکتے۔ یہ اردو ادب میں قائم رہنے والی ایک مستقل تھرتھراہٹ ہے کہ جس کا رخ ہمیشہ مستقبل کی طرف رہے گی۔''(۲۰)

عبدالحلیم شرر:

شرر تاریخی ناول نگاری کی ابتدا کرنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے ناول نگاری کا آغاز معاشرتی ناول ''دلچسپ'' سے کیا مگر جلد ہی تاریخی واقعات کو آئندہ کی ناول نگاری میں بطور موضوع استعمال کیا۔ شرر کا تاریخ کا بہت مطالعہ تھا اور اسی مطالعے کی بنیاد پر تاریخی ناول تخلیق کئے۔ شرر نے سر سید تحریک سے براہِ راست تو اثرات قبول نہیں کئے مگر متاثر ضرور تھے۔

شرر، سر سید کی فکر سے مکمل اتفاق کرنے والوں میں سے بھی نہیں تھے۔

''سر سید کا نام ان دنوں میں نے سنا تھا۔ اس عنوان سے کہ وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں یہ سن کر میرے خیالات نے یہ مسودہ تیار کیا کہ میں دینداری اور بے دینی کو ملا کر ایک کر دوں گا۔''(۲۱)

شرر کے سر سید سے اختلاف کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مگر ایک بڑا سبب یہ کہ وہ سر سید کی نسبت مستقبل کی راہیں ماضی کے واقعات کی بازگشت سے متعین کرنے کے آرزومند تھے۔ ایک ملاقات کا تذکرہ ہو جائے جو علی گڑھ میں قیام کے سلسلے میں سر سید سے ہوئی وہ خود اس ملاقات کا ذکر کچھ یوں کر رہے ہیں۔

''سید صاحب نے میرا حال پوچھا اور میں نے کہا لکھنو کا ایک طالب علم ہوں۔ دہلی میں مولوی نذیر حسین صاحب سے حدیث پڑھتا ہوں اور معقولات کی کتابیں مولوی عبدالحیٔ صاحب سے پڑھ چکا ہوں۔ سن کو خوش ہوئے اور کہا دہلی میں جا کر مولوی نذیر حسین صاحب سے میرا سلام کہنا۔ میں ان کا احترام کرتا ہوں اور قدیم سے ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہے۔ میں نے سلام پہنچانے کا وعدہ کر کے کہا سید صاحب! آپ نے ایک مقام پر تصویروں کے رکھنے کو جائز بتایا ہے۔ میں اس کو آپ سے سمجھنا چاہتا ہوں۔ فقہی فتویٰ سے قطع نظر کر کے میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح معمول ہے کہ ہر مزہب اور عاقلانہ طرز مروج زمانے سے رسم بن جاتا ہے اور اس کے صالح اغراض فوت ہو جاتے ہیں، اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ یہی تصویریں جو آج کسی دنیوی مقصد سے رکھی جاتی ہیں، چند روز بعد پوجی نہ جانے لگیں، جیسا کہ بت پرست اقوام میں ہوتا آیا ہے۔ اس پر سید صاحب نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا، اور فرمایا کہ آئندہ زمانے میں لوگ خدا کو تو پوجتے نظر آتے نہیں، تصویروں کو کون پوچھتا ہے۔ یہ جواب میرے

لئے تسکین بخش تو نہ تھا مگر سید صاحب کی بزرگی و عقل کے خیال سے خاموش رہا۔''(۲۲)

''شرر سرسید اور علی گڑھ تحریک کے حامی نہیں تھے۔لیکن کانگریس کے بھی ہم نوا نہیں تھے۔''(۲۳)

شرر کے تاریخی ناول ردِعمل کا نتیجہ ہیں شرر نے انگلستان میں تقریباً تین سال قیام کیا اور انہیں وہاں مغربی ادب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔علی عباس حسینی اور احسن فاروقی کا خیال ہے۔شرر نے اس قیام کے دوران والٹر سکاٹ کے ناولوں کے مطالعات کئے اور مذہبی تعصب کو محسوس کیا اور پھر ردِعمل کے طور پر''ملک العزیز ورجنا'' تصنیف کیا۔انہوں نے خود بھی اس کہانی کو بیان کیا ہے۔

''میں نے والٹر اسکاٹ کا ناول ''تے لس مین،(Talisman) پڑھا جو تیسری صلیبی لڑائی کو پیش نظر رکھ کے تصنیف کیا گیا تھا اور اس میں مسلمانوں کی اہانت کو دیکھ کر مجھے ایسا جوش آیا کہ اسی عنوان سے ایک ناول میں بھی لکھوں۔ چنانچہ یہی جوش نکالنے کے لئے میں نے ناول ''ملک العزیز ورجنا'' شائع کرنا شروع کیا۔''(۲۴)

شرر کے مذہبی رجحانات کا سبب اجداد کی حجاز سے نسبت ہے اور انہیں اس پر تفاخر بھی تھا۔ جب دولتِ عباسیہ کا مرکز بغداد ہوا تو شرر کے بزرگ بغداد میں اقامت نشیں ہوئے۔شرر نے اپنے ناولوں میں کئی اہم اور غیر اہم واقعات کو موضوع بنایا۔ان پر اعتراض بھی ہے کہ انہوں نے بعض تاریخی واقعات کو مسخ کیا ہے۔شرر کے تاریخی نتائج بھی تاریخی ناولوں کی طرح ہیں۔ان میں مخالفوں کی تذلیل اور جانبدارانہ رویہ نظر آتا ہے۔ ذاتی پسند و ناپسندی کو سامنے رکھتے ہوئے موضوعات کا انتخاب کیا۔بعض جگہوں پر اختلافی مسائل کو بھی ناولوں کا حصہ بنایا مثلاً سکینہ بنت حسینؓ کے متعلق دونوں فرقوں نے شدید مذمت کی تو اس ردِعمل کے جواب میں شرر کو تردید شائع کرنا پڑی۔

ہندوستانی سوسائٹی کے متعلق شرر کا رویہ مختلف ہے۔ وہ ہندوستانی قوموں کے اتحاد کے حامی تھے۔ ''منصور موہنا'' سرزمین ہندوستان کی تاریخ کے تناظر میں تخلیق ہوا۔ ناول میں مذہبی حوالے سے شرر کا رویہ غیر جانبدارانہ ہے۔ناول میں اگر مسلمانوں کی بہادری دکھائی ہے تو دوسری طرف راجپوتوں کی دلیری کے قصے بھی ہیں اور جے رام کی بہادری کی تعریف کی گئی ہے۔انہیں ہندوستان کی تاریخ سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی صرف اتنی کہ ایک ناول اس تناظر میں تخلیق ہوا۔اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ ہندوستان اور یہاں کے بسنے والوں سے مکمل طور پر لاتعلق تھے۔انہیں تاریخ سے زیادہ ہندوستانی معاشرت سے دلچسپی تھی۔اس حوالے سے''گذشتہ لکھنؤ'' ایک لازوال تصنیف ہے۔اس کے علاوہ اگر وہ کچھ اور نہ بھی لکھتے تو یہی تصنیف انہیں زندہ رکھنے کے لئے کافی تھی۔

ہم عصر ناول نگاروں سے ان کا تصورِ عورت مختلف ہے۔ وہ اسے مرد کے بہلاوے کی چیز سمجھتے ہیں ان

کے ناولوں میں عورت کا کردار غیر متحرک اورانسانی زندگی کی حقیقی روح سے کوسوں دور ہے۔

شرر کے بارے میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ یہ ناول ادبی نقطہ نظر سے کم اور تاجرانہ نقطہ نظر سے زیادہ لکھے گئے ہیں یہ ناول تجارت تو کر گئے مگر انہیں اچھے تاریخ ناول کی صف میں کھڑا کرنا ذرا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ **(۲۵)**

شاید یہی وجہ ہے کہ شرر کا تاریخی ناول کا تصور معتبر قابل تقلید مثال نہ بن سکا اوران کے مقلدین میں کوئی قابل ذکر نام نہیں لیا جا سکتا۔تو طے ہوا وہی ناول تادیر زندہ رہتا ہے جس میں ہم عصر زندگی کی خصوصیتوں کی حد پر بنایا گیا ہو۔

مرزا محمد ہادی رسوا:

شرر اور سرشار تو ایک لحاظ سے بالکل ہی ہم عصر تھے۔رسوا کا زمانہ دونوں کے بعد کا ہے۔رسوا اردو ناول کا زیادہ واضح تصور لے کر آئے رسوا جدید علم کے حامل تھے۔وہ بہت ذہین اوراپنے عہد کے پڑھے لکھے افراد میں شامل تھے۔ان کی دلچسپیاں اور مشاغل بہت ہی مختلف تھیں۔فارسی کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ اتالیق بھی تھے۔ انہوں نے فلسفے کی تصنیف پر امریکہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔زیادہ تر وقت ریاضی، نجوم اور نئے نئے آلات ایجاد کرنے میں گزارتے۔اردو شارٹ ہینڈ اور اردو ٹائپ رائٹر کے موجد ہیں۔

وہ ناول کو اپنے عصر کی تاریخ سمجھتے تھے۔اوراپنے عہد کی ناول نگاری سے مطمئن نہیں تھے اس پر ان کو سخت اعتراضات تھے۔ان کا ناول کا شعور اپنے عہد سے بہت بلند تھا۔وہ جانتے تھے۔شرر اور سرشار کی نامکمل واقعیت کو کیسے مکمل کیا جائے۔رسوا نے پانچ طبع زاد ناول تحریر کئے۔''امراؤ جان ادا'' پہلا مثالی ناول لکھ کر اردو ناول فنی عظمت عطا کی۔فنی عظمت فن سے گہرے عشق کے بغیر ممکن نہیں۔وہ ہر کام ڈوب کرنے کے عادی تھے۔

رسوا کو پہلا نفسیاتی ناول نگار بھی قرار دیا جاتا ہے۔وہ علم النفس کے ماہر تھے اور قصے میں اس کی اہمیت کو پہچان چکے تھے۔وہ ناصح نہیں بنتے۔بلکہ کردار کی زندگی کو زمینی حقیقتوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

> ''اردو ناولوں میں یہ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے ناول کے ہیرو کا اپنا ہیرو نہیں بنایا ہے اور یہی ان کی فنی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔'' **(۲۶)**

امراؤ جان ادا کا کردار تخلیق کرنے میں ان کے فن کا اندازہ ہوتا۔کردار کی نفسیاتی تہوں کو جذبے کے تمام اسباب کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔اعلیٰ تخلیقی ذہن جب گذشتہ زندگی کو جب اپنی نفسیات کی روشنی میں دیکھتا ہے تو کرداروں کی ناکامیوں اور کامیابیوں کا از سر نو تعین ہوتا ہے جبکہ نیکی اور بدی کی تمام قدریں وقتی ہیں۔

''امراؤ جان ادا'' کا ان زاویوں سے جائزہ لیں تو عہد کی قدریں مفروضے معلوم ہوتے ہیں۔آج کے

عہد میں امراؤ کے بارے وہ تصورات نہیں ہیں جن کے نتائج تب کی زندگی میں مرتب کئے گئے۔ وہ محض طوائف نہیں ایک ذہنی برتری کا نمونہ بھی ہے۔

وہ جاگیردار معاشرے کی پیداوار تھی اور جسمانی کے ساتھ تہذیبی خوبیوں کی بھی مالک ٹھہرتی ہے۔ وہ عزت واحترام کی مستحق ہے۔لیکن مصنوعی اور تضاد بھرے معاشرے کے رویے کو رسوا نے فطری اور فنی خوبیوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ رسوا میں سرسید سے ذہنی میلانات کی جھلک تو موجود ہے مگر وہ کلاسیکی روایات سے رشتہ توڑنے کے لئے بھی پوری طرح تیار نہیں بلکہ اعتدال سے کام لیتا ہے۔

سرسید کے مذہبی خیالات کے بارے حامیوں سے بھی ان کی اکثر چھیڑتی تھی۔

> ''سرسید کی تحریروں نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ سواد اعظم یا تو وہ مسلک اختیار کرے جو سرسید نے اختیار کیا تھا یعنی صرف لا الہ اللہ اور محمد رسول اللہ کا برائے نام قائل رہے۔ بلکہ سرسید تو ایسے ''وسیع الخیال'' تھے کہ ان کے نزدیک ملحد اور دہریہ بھی اس مشہور حدیث کی مصداق میں داخل ہیں۔:من قال لا الہ اللہ (الحدیث)''**(۲۷)**

رسوا نے زندگی کے بھرپور تجربات کئے اور ان کے بہت سارے متضاد شوق تھے کبھی کسی سے پیرا کی سیکھ رہے ہیں کبھی کسی کالج میں لیکچر دے رہے ہیں گھر میں نئی چیزیں ایجاد کرنے میں لگے ہیں۔ کبھی دوستوں کے درمیان مذہب اور فلسفے پر گفتگو جاری ہے۔ کبھی کسی مغنیہ سے غزل کی فرمائش ہو رہی ہے۔ آخری عمر میں موسیقی میں بھی کمال حاصل کیا۔ آلاتِ موسیقی کو بجانے میں بھی مہارت حاصل تھی۔

مرزا رسوا نے زندگی کے سارے تجربات حاصل کئے۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے مضمون ''مرزا رسوا کی شخصیت'' میں لااُبالی پن کا واقعہ تحریر کیا ہے۔

> ''کتاب خریدنے چوک کے کسی کباڑیے کے یہاں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک دوست ملے۔ انہوں نے خیریت پوچھی۔ مرزا نے رسماً جواب دیا۔ انہوں نے کہا لڑکا تو اچھا ہے۔ مرزا نے کہا، وہ کہیں چلے گئے ہیں۔ پوچھا کیوں؟ کہنے لگے۔ وہ اپنے اخراجات کے لئے زیادہ چاہتے تھے میں کفیل نہ ہو سکا اس لئے انہوں نے میرے ساتھ رہنا پسند نہ کیا اور چلے گئے۔ پوچھا کہ کسی سے دریافت کیا؟ کہنے لگے۔ دو ایک صاحبوں سے کہا تھا، ان کے دوست حیرت سے ان کا منہ تکنے لگے کہ دو مہینے سے برابر روزانہ ملاقات ہوتی تھی پھر بھی مرزا نے اس واقعے کا ذکر ان سے نہ کیا تھا۔''**(۲۸)**

رسوا نے فارسی، عربی، طب اور فلسفہ کی تعلیم اور انگریزی بھی پڑھی۔ فقہ اور علم الکلام کا مطالعہ بھی دقتِ نظر سے کیا۔

سائنس کی مہارتیں بھی حاصل کیں۔اس سبب وہ زندگی کو بھی بہتر طور پر سمجھ رہے تھے۔وہ متوازن کردار کے متلاشی تھے۔زندگی میں فتح مندی اور غربت و جہالت پر قابو پانے کی صحیح مثال ''شریف زادہ'' کے کردار عابد حسین میں نظر آتی ہے۔عابد حسین کے کردار کے ذریعے تعلیم کے نصب العین کی بات پیش کی گئی ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں انیسویں صدی کے آواخر کا لکھنؤ پیش کیا ہے۔یہ وہ لکھنو میں جو سرشار پہلے بنا چکے تھے۔مگر رسوا نے لکھنو کو ایک اکائی کی صورت میں بیان کرنے میں فنی صلاحیتوں کا بہترین اظہار کیا۔ان کے ہاں

''خواب اور بیداری کی دوایسی خیال انگیز تصویریں ہیں جن میں آخر انیسویں صدی کی سماجی وتہذیبی ہلچل آشکارا ہے۔''**(۲۹)**

رسوا کے کامیاب کرداروں میں زندگی کی پوری تڑپ موجود ہے اور یہ کردار متحرک ہیں۔جو اس دور کے دیگر ناولوں میں دکھائی نہیں دیتے۔مرزا نے ناولوں کا مواد لکھنو کی معاشرت سے لیا صاف اور سادہ انداز میں پیش کیا۔ان میں کوئی تصنع نہیں ہے۔جس زمانے کو رسوا نے لیا وہ زمانہ تمدن کی اعلیٰ مثال تو نہ تھا لیکن مٹتی ہوئی تہذیب کی داخلی کیفیات ضرور ہیں۔وہ اپنے زمانے کی اصلاحی تحریکوں سے بھی واقف تھے اس سلسلے میں ان کا شعور پختہ تھا۔اور اپنے عہد کو گہری نظر سے دیکھا۔بھرپور مشاہدہ کیا اور پھر علمی بصیرت سے گہرے تجزیئے بھی۔ذات شریف کے دیباچے میں تحریر ہے۔''میرے ناول میرے زمانے کی تاریخ ہیں۔''

رسوا کا زندگی کے بارے میں زاویہ نظر اپنے ہم عصر ناول نگاروں سے مختلف تھا۔انہوں نے معاشرت کے بعض ایسے پہلوؤں کی طرف نظر اٹھائی جو کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔

رسوا نے انحطاط پذیر زندگی کی خامیاں ہی نہیں گنوائی بلکہ اس کے لئے عابد حسین کا آئیڈیل کردار بھی تخلیق کیا جو خود اپنے عصر سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اس کا ذہن روایت سے زیادہ جدت پسند ہے۔اس کردار میں سرسید کی فکر کا عکس دکھائی دیتا ہے۔انیسویں صدی کے ادبی منظرنامے کی تبدیلی سرسید تحریک کی دین ہے۔اور اس اصلاحی و تعلیمی تحریک کو ناول میں قریب سے دیکھا جا سکتا ہے۔ناول سے ہی اس عہد کے نتائج مرتب کئے جا سکتے ہیں۔مذکورہ چاروں زاویے عہد سرسید کی اس تناظر میں بہت اہم ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مظہر حسین، ''علی گڑھ تحریک سیاسی اور سماجی مطالعہ''، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دلی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵

۲۔ ایضاً، ص ۱۶

۳۔ افتخار عالم خاں، پروفیسر، ''سرسید اور جدیدیت''، علم وفن پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۵۰

۴۔ اشفاق احمد اعظمی، ''نذیر احمد شخصیت اور کارنامے''، مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۵۲

۵۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۶۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۷۔ زینت بشیر، ڈاکٹر، ''نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار''، الیاس ٹریڈرس پبلشرز، حیدرآباد، ۱۹۹۱ء، ص ۸۴

۸۔ نورالحسن نقوی، ''نذیر احمد، (ہندوستانی ادب کے معمار)''، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ایڈیشن دوم، ۱۹۹۱ء، ص ۴۲

۹۔ زینت بشیر، ڈاکٹر، ''نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار''، ص ۹۰، ۹۱

۱۰۔ اشفاق احمد اعظمی، ''نذیر احمد شخصیت اور کارنامے''، ص ۲۴۰

۱۱۔ نورالحسن نقوی، ''نذیر احمد، (ہندوستانی ادب کے معمار)''، ص ۴۶

۱۲۔ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، ''اردو ناول کی تنقیدی تاریخ''، ادارہ فروغ اردو، امین آباد، لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۶۲ء، ص ۷۱، ۷۲

۱۳۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، ''رتن ناتھ سرشار، ہندوستانی ادب کے معمار''، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، ص ۲۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۳

۱۶۔ رتن ناتھ سرشار، ''الف لیلہ کا فصیح و بلیغ'' ترجمہ، تہذیب انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۷

۱۷۔ پریم پال اشک، مرتبہ: ''سرشار ــــ ایک مطالعہ''، آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی، ۱۹۶۴ء، ص ۹۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۹۹

۱۹۔ محمد عارف، ڈاکٹر، پروفیسر، ''اردو ناول اور آزادی کے تصورات''، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۴۹

۲۰۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''فسانہ آزاد ــــ ایک تنقیدی جائزہ''، اردو رائٹرس گلڈ، آلہ آباد، ۱۹۸۰ء، ص ۱۸۵

۲۱۔ عبدالحلیم، شرر، ''دلگداز''، جون ۱۹۳۳ء، ص ۱۲۴، ۱۲۵

۲۲۔ عبدالحلیم، شرر، ''دلگداز''، نومبر ۱۹۳۳ء، ص ۲۴۲

۲۳۔ جعفر رضا، پروفیسر، ''عبدالحلیم شرر، حیات اور کارنامے''، پروگریسو بکس، اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۱

۲۴۔ عبدالحلیم شرر،''دلگداز''،مئی ۱۹۳۱ء،ص ۱۹۷، ۱۹۸
۲۵۔ علی احمد فاطمی، ڈاکٹر،''عبدالحلیم شرر، بہ حیثیت ناول نگار''،انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۸ء،ص ۲۱۶
۲۶۔ علی عباس حسینی،''ناول کی تاریخ اور تنقید''،انڈین بک ڈپو، لکھنو، س ن،ص ۳۲۷
۲۷۔ ظہیر فتحپوری، ڈاکٹر،''رُسوا کی ناول نگاری''،حروف راولپنڈی، اپریل ۱۹۷۰ء،ص ۱۰۱
۲۸۔ محمد حسن، ڈاکٹر،''مرزا رُسوا کی شخصیت''، مشمولہ: رسوا ایک مطالعہ از میمونہ انصاری، میری لائبریری ،لاہور، ۱۹۸۸ء،ص ۱۱۲
۲۹۔ ظہیر فتحپوری، ڈاکٹر،''رُسوا کی ناول نگاری''،ص ۲۵۵